تقلید اور اصلاح ایک ساتھ نہیں چل سکتے اور نہ ہی تقلید اور تنویر (Enlightenment) کا اجتماع ممکن ہے۔ دانش انسانی کے استعمال میں سابقین کے تجربات سے ہم کسب فیض تو ضرور کر سکتے ہیں البتہ اس بات پر اصرار نہیں کر سکتے کہ اس عمل میں ہمارے اور ان کے نتائج یکساں ہوں۔ اگر نتائج کی یکسانیت کو ہدف قرار دے دیا جائے تو غور و فکر کا سارا سلسلہ لایعنی قرار پاتا ہے۔

پیمبرانہ لب ولہجہ کا غیاب

تاریخ کے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ کی حیثیت کافۃ للناس بشیرا و نذیرا کی ہے۔انسانی تاریخ کا یہ آخری رسول جب تک اس سرزمین پر موجود رہا، پوری نوع انسانی کو فلاح وکامرانی کی طرف بلاتا رہا۔محمد رسول اللہ کی دعوت میں ایک بین الاقوامی اپیل تھی۔تب اسلام کا مطلب ایک ایسی دعوت سمجھا جاتا تھا، جو انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرتی۔ بجھے دل اور شکستہ قلوب اسلام کی پناہ گاہ میں سکون و عافیت کا سامان پاتے۔ یہ اسی مسیحانہ آواز کا اثر تھا کہ جزیرۃ العرب سے اٹھنے والی اس آواز نے غیر اقوام کی صالح روحوں کو بھی بہت جلد اپنی جانب متوجہ کرلیا۔صہیب رومی ہوں یا بلال حبشی، سلمان فارسی ہوں یا دیگر غیر عرب افراد، ان سبھوں کو اسلام کی دعوت میں نجات ورحمت کا اتنا ہی امکان دکھتا تھا جتنا کہ عرب ثقافت کے مقامی رہنماؤں مثلا ابوبکر وعمر اپنے لئے اس نوید مسیحائی میں امکانات واپاتے تھے۔ یہ تھی وہ پیمبرانہ آواز جو رسول اللہ کی زبان مبارک سے بلند ہوئی اور جس نے دیکھتے دیکھتے تمام اقوام عالم کو اپنی جانب متوجہ کرلیا۔

آج گو کہ محمدؐ رسول اللہ کے متبعین کی تعداد ۱٫۶ بلین سے تجاوز کرگئی ہے۔اسلام ایک عالمی مذہب کے طور پر جانا جاتا ہے لیکن افسوس کہ کسی گوشے سے وہ پیمبرانہ آواز سنائی نہیں دیتی۔ دنیا اس نوید مسیحائی سے محروم ہے۔مسلمانوں کے تمام ہی بین الاقوامی فورم خواہ وہ تنظیم اسلامی کانفرنس ہو یا رابطہ عالم اسلامی، عرب لیگ ہو یا عالم اسلام کی دوسری معتبر تنظیمیں ہر جگہ اگر کوئی بحث جاری ہے تو وہ اس بات پر کہ مسلمانوں کو موجودہ معاشی، سیاسی، اور تعلیمی پستی سے کیسے نجات دلائی جائے۔اقوام عالم کے درمیان مسلم قوم کا وقار کس طرح بلند ہو۔رہی یہ بات کہ عالم انسانیت کو درپیش بحران مثلاً ماحولیات کی تباہ کاری، اسلحوں کی دوڑ، ایٹمی جنگوں کے خطرات، استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کے کتے شکنجے، دولت کا چند ہاتھوں میں ارتکاز، بین الاقوامی کمپنیوں کی اجارہ داری، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کا نظام استحصال اور گلوبلائزیشن کے ذریعہ پوری دنیا پر کستے شکنجے، جیسے خطرات کے سلسلے میں مسلم دنیا سے کوئی ایسی مؤثر آواز بلند نہیں ہورہی ہے جس پر دنیا کے کان کھڑے ہوسکیں، یا جس کے سبب دیگر اقوام کے یہاں یہ تاثر پیدا ہو کہ ہم اپنی ناک سے آگے بھی دیکھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آج اسلام ایک ایسے نظریہ کے طور پر سامنے آیا ہے، جو صرف مسلم فرقہ کے مفادات کا تحفظ کرسکتا ہے، بھلا کسی ایسے اسلام میں دیگر اقوام کے لئے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔اسلام کے اس فرقہ

وارانہ ایڈیشن میں جسے قومی مسلمانوں نے گذشتہ چند صدیوں میں تشکیل دیا ہے، دیگر اقوام کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی کشش نہیں رہ گئی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ اسلام کو ایک ایسے نظریہ کے طور پر دیکھتی ہے جسے اگر کامیابی مل گئی تو ان کا مستقبل تار تار ہو جائے گا۔ اقوام عالم پر مغربی اقوام کی موجودہ سبقت یکسر ختم ہو جائے گی۔ حالیہ برسوں میں امریکہ کی قیادت میں دہشت گردی کے خلاف جو مہم جاری ہے اس کے پیچھے دراصل قومی اسلام سے متعلق یہی وہ اندیشے ہیں جس نے مغربی دانش وروں کو تہذیبوں کے مابین جنگ کا بگل بجانے پر آمادہ کیا ہے۔

لیکن حقیقت صرف اتنی نہیں، اس مسئلہ پر ایک دوسرے نقطہ نظر سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حالیہ برسوں میں کمیونزم کے زوال اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کی کامیابی نے مغرب میں مابعد تاریخ (post-era sensibilities) کے احساسات کو عام کیا ہے۔

مغربی دانشور یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ایک طویل کشمکش کے بعد بالآخر جمہوریت کی فتح نے انسانی تاریخ کو اس کی منتہیٰ تک پہونچا دیا ہے۔ آگے کی معنویت کے سلسلے میں ان کے ذہنوں میں ایک پراسرار خلا پایا جاتا ہے۔ دوسری طرف اسلامی حلقوں کی جانب سے مزاحمت کا سلسلہ ابھی پوری طرح رکا نہیں ہے۔ اس صورت حال نے مغرب کو شاید یہ سمجھنے پر مجبور کیا ہے کہ مزاحمت کی اس آخری آواز کا قلع قمع کئے بغیر جمہوریت کو مکمل اور حتمی فتح نہیں دلائی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم حلقوں سے اٹھنے والی نسبتاً کمزور اور نحیف آوازوں کو بھی مغرب ایک بڑے خطرے کے طور پر دیکھتا ہے اور بسا اوقات کمزور مزاحمت کو بھی ذرائع ابلاغ اس طرح دکھاتے ہیں گویا اگر اس سے فی الفور نہ نپٹا گیا تو تمام اقوام عالم کا سکون خطرے میں پڑ جائے گا۔ یہ سچ ہے کہ اسلام اور مغرب کی اس کشمکش میں ذرائع ابلاغ دانستہ طور پر اسلام کی شبیہ داغدار کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ البتہ اس پورے منظرنامہ میں جو چیز سب سے زیادہ تشویشناک ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کی طرف سے اٹھنے والی ان آوازوں میں کہیں بھی وہ پیمبرانہ وسعت دکھائی نہیں دیتی جو ابتدائی عہد میں مسلمانوں کا خاصہ ہوا کرتی تھی۔ اگر مسلم اہل فکر اور علمائے اسلام اپنی تمام تر توجہ اس بات پر صرف کرتے رہے کہ مسلمانوں کا قومی دبدبہ کس طرح قائم ہو، فرقہ مسلم کو اقوام عالم میں کس طرح باوقار مقام عطا کیا جائے اور اگر آخری نبی کے متبعین کے حلقوں سے عام انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے ہانکے پکارے آواز لگانے والے معدوم ہو جائیں تو پھر دنیا کو پیمبرانہ آواز کہاں سے سنائی دے گی۔ جب تک اسلام کی دعوت لوگوں کو ایک خدا کی طرف بلاتی رہی، اسی خدا کی طرف جو صرف مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ تمام اقوام عالم کا رب ہے۔ اسلام کی دعوت ایک بین الاقوامی صداقت کا مظہر تھی لیکن جب سے اسلام کو مسلمانوں نے قومی افتخار کے پروجیکٹ میں تبدیل کر دیا اسلام عبودیت کے بجائے محض ایک قومی شناخت بن کر رہ گیا، ایک ایسی قومی شناخت جس میں دوسروں کے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہ گئی۔

اسلام کے نظری قالب میں تبدیلی یا انحراف کا یہ عمل عہد عباسی کے ابتدائی ایام میں راہ پانے لگا تھا جب بعض سیاسی عوامل کے زیر اثر ہمارے فقہاء اسلام کو ایک آفاقی پیمبرانہ دعوت کے بجائے مسلم سلطنت کی نظری بنیاد کے طور پر دیکھنے لگے تھے۔ اسی عہد میں دنیا کو دارالاسلام اور دارالکفر کی اصطلاحوں میں دیکھنے کا رجحان تشکیل پایا اور یہ بحث بھی شد و مد کے ساتھ سر اٹھانے لگی کہ مسلمان ہونے کے لئے لازم عقائد کیا کیا ہونے چاہئے۔ خلافت منہاج النبوۃ سے منحرف ہو چکی تھی۔ اولوالأمر کے منصب پر ملوک و سلاطین کی حکمرانی نے اسلام کو ایک ایسی نظری قوت کے طور پر پیش کیا جو مسلم سلطنت کی توسیع کے لئے نظری بنیاد فراہم کرتا ہو۔ اس عہد میں نہ صرف یہ کہ یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ مسلمان کون ہے بلکہ فقہاء نے جمہور مسلمانوں کے لئے اہل سنت و الجماعت کے نام سے عقائد کا ایک بنیادی محضر بھی تیار کر ڈالا۔ خلق قرآن کی بحث صرف فقہی یا فنی موشگافی نہیں تھی بلکہ اس کے ذریعہ سرکاری علماء کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ اسلام کی تشریح و تعبیر پر اپنا کنٹرول مستحکم کر لیں اور اس طرح اسلام کو سلطنت کی خدمت پر مامور کرنے کی راہ ہموار ہو جائے۔ گو کہ اس عہد میں ابن حنبل اور دیگر اہل حق اس مہم میں پوشیدہ خطروں کو بھانپ گئے اور اس کے خلاف حتی المقدور مزاحمت بھی کی لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود آفاقی اسلام کو مسلمانوں کے ثقافتی ورثہ میں محدود کرنے سے نہ بچایا جا سکا۔ اسلام ایک پیمبرانہ دعوت کے بجائے مسلم ریاست کے نظری حلیف کے طور پر سامنے آیا اور علماء انبیائی دعوت کے امین بننے کے بجائے اسی منحرف ریاست کے شیخ الاسلام بننے پر قانع ہو گئے۔ قرآن جو کبھی تمام عالم انسانیت کے لئے کتاب بشارت سمجھی جاتی تھی اب صرف مسلمانوں کی مذہبی کتاب بن کر رہ گئی حتی کہ وہ تمام قرآنی آیات جن میں اہل کتاب اور اہل ایمان کے دیگر طائفوں کے لئے ﴿لا خوف علیهم و لا هم یحزنون﴾ کی بشارت دی گئی تھی ہمارے فقہاء نے اپنی فقہی موشگافیوں کے زیر اثر انہیں منسوخ کر ڈالا اور نجات سے متعلق ان نازک اور حساس موضوع پر فیصلہ کرنے بیٹھ گئے جسے خدا نے اپنے خصوصی دائرہ اختیار میں رکھا تھا اور جس کے بارے میں قرآن کا ارشاد تھا ﴿ان الله یفصل بینهم یوم القیامة﴾۔

قرآن کلام اللہ ہے تو کن معنوں میں؟ کیا اللہ نے محمدؐ سے بزبان عربی کلام کیا؟ یا اس نے اپنا پیغام محض اپنے رسول کے قلب پر نازل کیا۔ خدا کا کلام جسے انسانی زبان بیان کرنے سے قاصر ہے ایک انسانی زبان میں کس طرح ظہور پذیر ہوا؟ کیا قرآن کا کلام اللہ ہونا اسی معنوں میں ہے جس طرح حضرت عیسیٰ کو کلمۃ اللہ کہا جاتا ہے یا جسے عیسائی لٹریچر میں Logos سے تعبیر کرتے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا براہ راست تعلق اسلام کے اس ایڈیشن سے ہے جو عہد عباسی میں تشکیل پایا تھا اور جو سلطنت کے سرکاری نظریہ کے طور پر معروف ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ محمد رسول اللہ پر جب خدا نے اپنی وحی نازل کی تو وہ جزیرۃ العرب کا ایک تاریخی منظر نامہ تھا لیکن یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ آپ کی حیثیت رسول عربی کے بجائے ایک عالمی پیغمبر ﴿کافة للناس بشیرا و نذیرا﴾ کی ہے اور اسی لئے قرآن متبعین محمدؐ کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ وہ قومی شناخت قائم کرنے کے بجائے

نظری شناخت کے حامل ہوں۔لیکن ﴿کونوا ھودا او نصاریٰ قل بل ملة ابراھیم حنیفا﴾ پر ازحد اصرار کے باوجود صبغة اللہ اختیار کرنے کی طرف ہماری توجہ کم ہی گئی۔لسانی ثقافتی شناخت کے بجائے صبغة اللہ پر اصرار اور ﴿کونوا ربانیین﴾ کی دعوت اس بات سے عبارت تھی کہ محمد رسول اللہ کے متبعین نہ تو کسی مقامی ثقافت کے اسیر ہوں گے اور نہ ہی کوئی جغرافیائی یا لسانی شناخت ان کا طرۂ امتیاز ہوگی۔لیکن عملاً یہ ہوا کہ عباسی فقہاء کے زیر اثر اسلام کی آفاقی دعوت عروبہ کی سرحدوں میں محدود ہوگئی۔آج بھی یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ کیا عرب ثقافت کے بغیر اسلام کا کوئی قالب تشکیل پا سکتا ہے یا یہ کہ قرآن مجید کے معانی عربی زبان کے لغوی اور جاہلی شعری استعمال سے ماوراء سمجھے جا سکتے ہیں یا نہیں۔

بالفاظ دیگر کیا یہ ممکن ہے کہ قرآن مجید کی تشریح وتعبیر میں عربی زبان کی وجہ سے عرب اقوام کو ہمیشہ فوقیت کا حامل بتایا جائے یا غیر عرب اقوام کے لئے بھی یہ ممکن ہے کہ وہ لسانی موشگافیوں سے ماوراء کتاب ہدایت کی حیثیت سے اس پر اتنا ہی حق جتائیں۔ یہ وہ سوالات ہیں جس نے ماضی میں مسلم اہل فکر کو قدرے حیرانگی اور تذبذب میں مبتلا رکھا ہے۔مثال کے طور پر جب محمد اقبال نے خلافت عثمانی کے زوال کے بعد اس امید کا اظہار کیا کہ اب سرکاری تعبیری نظام کے معدوم ہوجانے سے ایک ایسے اسلام کی بازیافت ممکن ہو سکے گی جو عرب ثقافت کی چھاپ سے آزاد ہو تو شاید ان کے ذہن میں اسی آفاقی اسلام کا تصور تھا جو اٹھا تو عرب کی سرزمین سے تھا لیکن اس میں غیر عرب اقوام کے لئے یکساں نجات کی بشارت سنائی دیتی تھی۔اقبال کی توقع کے برعکس ہمارے عہد میں اسلام کے ایک ایسے آفاقی ایڈیشن کی بازیافت، جو عربیت اور دوسرے ثقافتی قالب سے ماوراء ہو، اب شاید اتنی آسان نہیں رہی۔ہمارے عہد میں زبان کے سلسلے میں بعض ایسے نظریے وضع ہوئے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ کسی متن میں وہی کچھ نہیں ہوتا جس کا اظہار الفاظ کرتے ہیں کہ ہر قاری کے دل ودماغ میں الفاظ کی جہتیں اور معانی کی پرت مختلف ہوتی ہے۔گویا پڑھنے والا صرف متن ہی نہیں پڑھتا بلکہ اپنے رجحانات کو بھی متن میں پڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ ایک ایسا غیر محسوس عمل ہے جس سے بچنا مشکل ہے۔

Deconstruction کی فلسفیانہ موشگافیوں نے ہمارے بعض مسلم اہل فکر کو غرطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے جس سے اس بات کا اندیشہ پیدا ہو چلا ہے کہ متن کو اپنے اپنے ذہنی رجحانات کے زیر اثر پڑھنے کی یہ لے ہمیں کہیں اس کے اصل پیغام سے ہی محروم نہ کردے۔

معاصر علماء میں محمد ارکون اور نصر ابوزید ان لوگوں میں سے ہیں جو وحی ربانی کی تشریح وتعبیر میں ان سوالات تک جا نکلے ہیں جن کا جواب انسانی عقل فراہم نہیں کر سکتی۔عہد رسول میں بھی جب پوچھنے والوں نے یہ پوچھا کہ خدا کس طرح وحی کا نزول اپنے پیغمبر پر کرتا ہے تو اس بارے میں صرف اتنی بات کہی گئی کہ یہ امر ربی ہے۔گویا سوال کا یہ حصہ کہ قرآن مجید معانی اور متن ہر اعتبار

سے کلام الٰہی ہے اسی پرانی بحث کو تازہ کرتا ہے جو خلق قرآن کے حوالے سے کبھی عہد عباسی میں ہمارے انتشار فکری کا سبب بنی تھی۔ بات یہ ہے کہ نزول وحی کا پورا عمل انسانی حیطۂ ادراک سے باہر ہے۔ یہ وہ ممنوع وادیاں ہیں جن میں ہمارا داخلہ قرآن اور وحی کی تعبیر و تفہیم میں مدد کرنے کے بجائے ہمارے ہوش وحواس کو بری طرح مجروح کر دیتا ہے۔ ایک ایسے وثیقۂ وحی کو جو فی نفسہ لازوال ہو زمان ومکان کی قیود سے ماوراء سمجھنے کی کوشش مستحسن سمجھی جائے گی، البتہ انسان جو زمان ومکان کا قیدی ہے اس عمل سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ جو کر سکتے ہیں وہ یہ کہ نئے سیاق میں اس کتاب ہدایت کو از سر نو سمجھنے کی کوشش کریں اور معانی کی ان تہوں تک پہونچنے کی کوشش کریں جہاں ہمارے متقدمین بوجوہ پہونچنے سے قاصر رہے تھے۔ قرآن بلاشبہ ایک لازوال وثیقۂ وحی ہے لیکن اس کے تمام ابعاد کی تفہیم کے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم عہد رسول کے زمان ومکان کے ابعاد سے صرف نظر کرسکیں۔ deconstruction age کے معاصر مفکرین جن میں محمد ارکون سرفہرست ہیں محض اس بات کی دعوت نہیں دے رہے ہیں کہ متن وحی کا نئے علوم مثلاً Anthropology اور Sociology کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے بلکہ وہ اپنی سادہ لوحی میں ان ممنوع وادیوں میں جا نکلے ہیں جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں اور جس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی محدود دماغی ساخت کے ذریعہ وحی جیسے ماورائے ادراک عمل کو اپنے حیطۂ ادراک میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ارکون کے یہاں طریقہ ترسیل کو سمجھنے کی لمبی چوڑی تھکا دینے والی بحثوں کے باوجود قاری کو جدید لسانیاتی نظریوں اور فیشن ایبل اصطلاحوں کے علاوہ کچھ اور ہاتھ نہیں آتا۔

عہد رسول میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو طریقہ ترسیل کے عمل میں تاک جھانک کی نفسیات کا مظاہرہ کرتے ہوں، جیسا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے۔ پوچھنے والوں نے پوچھا ﴿یسئلونك عن الروح﴾ اے محمد وہ تجھ سے نزول وحی کی بابت پوچھتے ہیں۔ ﴿قل الروح من امر ربی﴾ کہہ دیجئے ترسیل وحی بس امر ربی ہے، منشاء الٰہی ہے۔ (الاسراء:۵۸)۔

ایک دوسرے سیاق میں قرآن نے ترسیل وحی کے تین طریقوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن وہاں بھی فی نفسہ اس طریقہ کی سریت سے پردہ نہیں اٹھایا گیا۔ شاید خدا اس راز کو بندوں پر افشا کرنا نہیں چاہتا۔ یا نزول وحی کا یہ سارا عمل اتنا پیچیدہ ہے کہ انسانی عقل اس کا احاطہ نہیں کرسکتی اور یہ کیونکر نہ ہو خدا کے کلام کو جو ایک ایسی ہستی ہے جس کا کوئی شئے احاطہ نہیں کرسکتی، انسانی زبان میں ڈھالنا لامکان سے مکان کی طرف ایک ایسا سفر ہے جس کا احاطہ انسانی عقل کے بس کی بات نہیں۔ سریت کے اس پردے کے پیچھے کیا ہے اس بارے میں ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ واللہ اعلم۔

قرآن مجید کی ایک ایسی تعبیر جو عرب تاریخی اور ثقافتی پس منظر سے ماوراء ہو لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا رشتہ زمانی اور مکانی طور پر عہد رسول کی عربی ثقافت سے پوری طرح منقطع نہ ہوا ہو ہمیں ایک ایسے اسلام کی بازیافت سے دوچار کرسکتا ہے جسے ہم

اسلام کی سچی تعبیر کہہ سکیں۔طریقۂ ترسیل کے سلسلے میں ہمارا تجسس یقیناً ہمیں وحی کو سمجھنے میں کچھ زیادہ مدد نہیں کرتا اس کے برعکس ہمیں اپنی ساری توجہ اس امر پر مرکوز کر دینی چاہئے کہ متن کو اپنے عہد میں کتاب ہدایت کے طور پر کس طرح پڑھا جائے تا کہ متقدمین کی طرح ہماری موجودہ نسل بھی اپنے عقل وادراک کی تمام تر پونجی وحی کو سمجھنے میں صرف کر سکے۔گویا ہم جیتے تو موجودہ زمانے میں ہوں لیکن ہمیں عہد رسول میں مکانی سفر کا سلیقہ آتا ہو۔تفہیم وحی کا یہی وہ منہج ہے جس کے ذریعے آج ہماری اس پیمبرانہ آواز تک رسائی ہوسکتی ہے۔

قرآن یقیناً خدا کے الفاظ پر مشتمل ہے لیکن یہ الفاظ مردہ نہیں ہیں۔یہ مسلسل نمو پذیر ہیں۔یہ ایک ایسا prism ہے جس کے ذریعہ ہم ہر عہد کو مختلف روشنیوں میں گھرا دیکھتے ہیں۔یہاں ماضی اور حال مجسم نظر آتا ہے۔وحی کا یہ دفتر ہم سے اس بات کا طالب ہے کہ ہم اس کے مطالعہ میں اپنی تمام تر علمی فکری اور ذہنی توانائیاں صرف کر دیں۔ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ قرآن جیسی عظیم شئے عام انسانوں سے اس بات کی طالب ہوتی ﴿أفلا يتدبرون القرآن أم على قلوب اقفالها﴾ (محمد: ٢٤) جو لوگ الفاظ قرآنی کو ایک ایسا مجموعۂ عبارت سمجھتے ہیں جو لغت کے ڈھانچہ سے اپنی آخری شکل میں نکل چکا ہے وہ پھر اس بات پر خود کو مجبور پاتے ہیں کہ ان الفاظ کے معانی مخصوص تاریخی تناظر میں ہی متعین کئے جائیں ایسا کرنے والے نہ صرف یہ کہ الفاظ اور ان کے معانی کو منجمد کر دیتے بلکہ وہ وحی کا مطالعہ تاریخ کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں اور تاریخ اپنی تعریف کے اعتبار سے ایک ایسا ماخذ ہے جس پر پوری طرح انحصار نہیں کیا جاسکتا۔تاریخ کو وحی کی کلید قرار دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وحی ربانی کی موجودگی کے باوجود ہم اس سے روشنی حاصل کرنے سے محروم ہیں اور یہی غلطی وہ لوگ کرتے ہیں جو وحی جیسے لازوال ماخذ کو Sociology یا Anthropology جیسے غیر نمو یافتہ علوم کے ذریعہ سے وحی کے مطالعہ کے داعی ہیں۔مشکل یہ ہے کہ روایتی علماء جو تاریخ کے حوالے سے قرآن کے مطالعہ کے خوگر ہیں اور جدید دانش ور جو جدید نمو پذیر سماجی علوم کے توسط سے قرآن کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں دونوں ہی کو اس بات پر اصرار ہے کہ تشریح وتعبیر کا حق انہیں ہی حاصل ہے۔

ہم جس دنیا میں سانس لے رہے ہیں اس میں ہر طرف ہر لمحہ زندگی کا سفر جاری ہے۔کائنات ہر لمحہ اپنے آپ کو منکشف کر رہی ہے۔اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لینا اور تشریح وتعبیر کو محض طبقۂ خاص کا حق قرار دینا ایک بات ہے اور وثیقۂ وحی کو اپنے خاص سباق میں از سر نو سمجھنے کا عزم کرنا بالکل دوسری بات۔جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو یہ رویہ ماضی میں مذہب کے نام پر نظام جبر کے قیام کا سبب بنا ہے۔رہی دوسری بات تو ہمارے عہد میں اپنی تمام تر علمی پونجی کو بروئے کار لاتے ہوئے تعبیر وحی کی از سر نو کوشش کا کام ابھی باقی ہے۔مذہب کے نام پر جب بھی نظام جبر کے قیام کی کوشش ہوئی ہے اور جب بھی مذہب کے حوالے سے انسانی عقل پر پہرے بٹھانے کا غیر مستحسن کام کیا گیا ہے اس صورتحال نے ہمارے اجتماعی نظام کو تہہ وبالا کر دیا ہے۔اہل یہود

کے یہاں معبد کی مذہبی زندگی جسے دراصل احبار کی حکومت کہنا چاہئے، دوبارا پنے دردناک انجام کو پہونچی اور آج اہل یہود بھی یروشلم کی عظمت لوٹائے جانے کی راہ تک رہے ہیں۔ یہودی علماء نے خدا کے عظیم آفاقی پیغام کو اپنی بند دماغ تشریحی کوششوں سے ایک فرقہ وارانہ ثقافتی دین بناڈالا۔ جس میں نجات کا امکان صرف اہل یہود کے لئے باقی رہ گیا۔ کچھ یہی صورتحال عیسائی دنیا میں پیدا ہوئی جہاں حضرت مسیح کے حوالہ کے بغیر نجات کا ہر امکان سرے سے مسترد کر دیا گیا۔ چرچ کے قائدین حضرت مسیح کے حوالے سے نجات کے پروانے جاری کرنے لگے۔ صورتحال یہاں تک آپہونچی کہ حضرت مسیح کے زبانی نام لیواؤں کے علاوہ تمام اقوام عالم پر نجات کا دروازہ بند سمجھا گیا۔

کچھ یہی صورت حال عثمانی خلافت کے ساتھ پیش آئی جہاں اسلام کی آفاقی دعوت گم ہوگئی پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ محض اس کے نام سے سلطنت کا عظیم ڈھانچہ برقرار رہ پاتا۔ تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جب بھی مذہبی گروہوں نے آفاقی پیغام سے منھ موڑ کر ایک فرقہ وارانہ شناخت کو اپنا شعار قرار دیا ہے اور جب بھی انہوں نے دنیوی کامیابی اور اخروی نجات پر دوسری اقوام کے لئے دروازے بند کئے ہیں انہوں نے اپنے آپ کو ایک ایسی صورتحال میں پایا ہے جہاں سے نکلنے کے تمام راستے معدوم ہوگئے ہوں۔ جب وحی کی تعبیر فرقہ وارانہ ذہنیت کی اسیر ہوجائے تو انسانوں کو ایسا لگتا ہے کہ خدا کی کتاب کے الفاظ منجمد ہوں جس نے کبھی ان کے پرکھوں سے کلام کیا تھا، وہی پرکھے جنہیں ہر مردہ قوم Pious Elders یا سلف صالح سے تعبیر کرتی اور ان کی اتباع کو خدا اور اس کے رسول کی اتباع سے زیادہ اہم سمجھتی ہے۔ جب وحی کے لازوال الفاظ، ایسا محسوس ہو کہ، انسانوں سے کلام نہیں کر رہے ہوں تو عام انسانوں کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنے آپ کو سلف صالحین کی غیر مشروط اتباع میں دے دیں۔ اس غیر تخلیقی اور غیر صحت مندانہ رویہ سے جھوٹی دینداری وجود میں آتی ہے۔ انسانِ رسومِ دینداری کو غایت دین سمجھنے لگتا ہے۔ اور پھر مذہب کے نام سے مذہب کی نفی پر مبنی نظام جبر کا قیام عمل میں آجاتا ہے۔ خدا یہ چاہتا ہے کہ انسانوں کی گردنیں انسانوں کی تابع داری سے آزاد ہوں اور اسی لئے وہ بندوں کی طرف اپنے پیغامبر بھیجتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس جھوٹی دینداری کے امین مذہب کے نام پر احبار کا نظام جبر قائم کر دیتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں خدا کے سچے پیغمبروں کو رسمی دینداری کے ہاتھوں جو اذیتیں اٹھانی پڑی ہیں اس کی کوئی نظیر کسی دوسرے طبقہ کی طرف سے کی جانے والی مخالفت میں نہیں ملتی۔

آج ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں۔ اس کے بارے میں مغرب میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جارہی ہیں۔ مابعد تاریخ کے احساسات نے مغرب کو اپنی تاریخ کے سب سے بڑے بحران سے دوچار کر رکھا ہے۔ مغرب میں فلسفہ کے زوال نے اسے ایک لسانیاتی خوشہ چینی کا فن بنا دیا ہے۔ یہی حال مغربی جمہوریت کا ہے جو کسی نظام انصاف کے قیام میں ان ملکوں میں بھی ناکام رہی ہے جنہیں جمہوریت کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ آج نہ صرف یہ کہ جدید سائنس اپنے تمام ابعاد کے ساتھ علماء و

مفکرین کے ہاں محل نظر ہے بلکہ مغرب میں مروجہ سماجی رویہ مثلاً اسقاط حمل، ہمزاد شادیاں اور رشتۂ ازدواج سے ماوراء جنسی تعلقات اب پھر سے موضوع بحث بن گئے ہیں۔ یہ وہ موضوعات تھے جن کے بارے میں کبھی سمجھا جاتا تھا کہ ان پر اب کسی گفتگو کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ جدید مغرب اپنی کشش کھو چکا ہے اب اس کے بطن سے کیا کچھ برآمد ہونے کو ہے اس بارے میں ابھی کچھ کہا جانا قبل از وقت ہے۔

گذشتہ چند دہائیوں میں بین المذاہب مکالموں اور اجتماعات کے لئے بڑا جوش وخروش دیکھا گیا ہے۔ مختلف مذاہب کے سعید نفوس اس مسلسل سمٹتی ہوئی دنیا میں خود کو علاحدہ رکھنے میں دشواری محسوس کرتے اور انہیں یہ بات مسلسل کچوکے لگاتی رہتی ہے کہ وہ اخروی نجات کے امکانات پر صرف اپنی اجارہ داری قائم رکھیں۔ لاطینی امریکہ کی لبریشن تھیولوجی، تائیوان کی ہوم لینڈ تھیولوجی، کوریا کی من یونگ تھیولوجی اور ہندوستان میں دلتوں کے حقوق انسانی کو تسلیم کرنے کے لئے کی جانے والی کوششیں، دراصل جدید دنیا کی باقیات ہیں جن کے خرابے سے ہمارے کانوں میں مسلسل ایک ایسی آواز آرہی ہے جسے مستقبل کا روحانی نغمہ کہا جاسکے۔ سمٹتی سکڑتی دنیا نے انسانوں کو از سر نو اپنی بازیافت پر مجبور کیا ہے۔ فرقہ وارانہ دینیات کے بجائے ایک عالمی دینیات کی تشکیل کے لئے فضا کافی سازگار ہوگئی ہے۔ اسلام کے اس آفاقی پیغام کی بازیافت کا وقت گویا اب آپہنچا ہے۔ مسلمان اگر اسلام کو مسلم قومی ورثہ کے بجائے رب العالمین کے لازوال پیغام کی حیثیت سے پیش کرسکیں تو وہ محسوس کرینگے کہ تمام اقوام عالم خدا کی نغمہ سرائی میں ان کے ساتھ شریک ہوگئی ہیں:

ساری تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے
نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے
روز جزاء کا مالک ہے۔
اے اللہ! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد کے طلبگار ہیں
اے اللہ تو ہمیں سیدھے راستے کی رہنمائی فرما،
ان لوگوں کا راستہ جن کو تو نے انعام واکرام سے نوازا،
نہ کہ ان لوگوں کا جن پر تیرا غیظ وغضب نازل ہوا۔ (قرآن ۱ : ۱-۶)